ڈاکٹر خالد اقبال یاسر
ڈائریکٹر جنرل، اردو سائنس بورڈ ، لاہور

اردو زبان: مسائل اور امکانات

Dr. Khalid Iqbal Yasir

Director General,Urdu Science Board, Lahore

Urdu Language: Problems and Probabilities

Since the evolution of Urdu language it has faced great challenges. Linguists are apprehending the extinction of the most popular language of Indo-Pak region. Effects of Globalization and blitz of modern communication have played a great role in the downfall of spoken and written Urdu Language. Conflicts of Urdu with other languages like Hindi-Urdu in India and Urdu-Bangla in East Pakistan (Now Bangladesh) have also affected its evolution. It is very difficult to use Urdu as medium of instructions in a multilingual society like Pakistan. It is a fact that government could not devise a separate national language policy to bring closer the users of different provincial and regional languages. Despite facing different challenges Urdu has still preserved in its innovation, diversification and beauty of the syntax and philology.

Experts agree with the view that education in an alien language may create differences between the elite and masses. Therefore, all children should be taught in their mother tongue or native language. Need to formulate a foresighted theory by government is stressed in this paper to address the linguistic issues and to suggest remedies of these problems.

یہ ایک عجیب سی بات لگتی ہے کہ ایک طرف تو اردو دنیا کی چند بڑی زبانوں میں سے ایک ہے اور دوسری طرف اس کی معدومیت کے خدشے پر تشویش کا اظہار بھی ہونے لگا ہے۔ اس تشویش کی جڑ ایک طرف تو اردو رسم الخط کے ارتقاء کی تاریخ میں پیوست محسوس ہوتی ہے اور دوسری طرف اس کے نام 'اردو' کے سلسلے میں بھی ابتدائی اختلافات میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ اردو کے انگریزی اور ولندیزی ماہرینِ لسانیات نے جب اردو کو ایک غیر ملکی زبان کے طور پر سمجھنے کی کوششیں شروع کی تھیں تو اسے اردو کی بجائے ہندوستانی کہا تھا۔ ان دنوں بھی ہندوستان بھی ہندوستان میں ہندی، پنجابی، ہریانوی، پوربی ملی کھچڑی زبان کو ہندوستانی کہا جارہا ہے۔ اردو کو یہ نام دینے پر اور پھر للّو لال جی کی تالیف غالباً 'پریم سبھا' سمیت چند ابتدائی کتابوں کو اپنے سیاسی مفادات کی خاطر دیوناگری میں شائع کرنے کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں اختلافات کی خلیج رفتہ رفتہ گہری ہوتی چلی گئی اور بالآخر تحریکِ پاکستان کے نتیجہ خیز دور میں قائدِ اعظم محمد علی جناح اور جواہر لال نہرو کے درمیان ہندوستان کی آئندہ مشترک زبان یعنی Lingua Franca پر بحث ومباحثہ کا موجب بنی اور دونوں ایک دوسرے کے مؤقف کے قائل نہ سکے۔

اب کہیں آ کر شمس الرحمٰن فاروقی جیسے محققین نے یہ بات سمجھی ہے کہ ''زندہ زبانوں کے معاملے میں کسی ایک شہر یا علاقے یا خطّۂ ملک میں رائج قول وعمل تمام لوگوں کے لیے حجت کا درجہ''(۱) نہیں رکھتا لیکن اردو کے معاملے میں زبان دانی کے دعویدار اور اِسے خالص رکھنے کے علمبردار تہذیبی برتری کے غلط یا صحیح خمار میں اب بھی انشاءاللہ خان کی اس بات پر کان دھرنے کو تیار نہیں ہیں کہ ''جو لفظ اردو میں آیا وہ اردو ہوگیا۔ خواہ وہ لفظ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی۔ اصل کی رُو سے غلط ہو یا صحیح وہ لفظ اردو کا لفظ ہے۔ اگر اس کے خلاف ہو تو بھی صحیح''۔ (۲)

اردو کو رومن رسم الخط میں تحریر کرنے کی تجویز بھی ایسے ہی اختلافات کا غیر حقیقت پسندانہ ردِّعمل تھی ورنہ اردو زبان کثیر اللّسانی پاکستانی معاشرے میں ای۔ سپائر کے مکتبۂ نظر کے مطابق ایک غیر جذباتی اور خود کار ذریعۂ ابلاغ کے طور پر پاکستانیوں میں یکسانیت کے احساس کو اتنا گہرا کرسکتی تھی کہ اسے ہمارے مشترکہ زبان اور سرکاری زبان کے طور پر قبول کیا جاچکا ہوتا۔

نو آبادیاتی زمانے سے انگریزی کے بطور سرکاری زبان غلبے کے سبب پاکستانی اشرافیہ نے بھی انگریزی کو اپنی حکمرانی کے تسلسل کے لیے ایک آلے کے طور پر کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ تب سے اردو محروم طبقوں کی زبان چلی آرہی ہے لیکن معیاریت کی ایک قابلِ قبول سطح تک پہنچنے کے باوجود اسے سرکاری زبان کے طور پر آئینی حق کے باوجود رائج کرنے سے گریز کیا جاتا رہا ہے۔ اگر اسے سرکاری زبان قرار دے دیا جاتا تو اس سے اس کی معیاریت اور جدید لسانیات کے وضع کردہ پیمانوں پر پورا کرنے کی صلاحیت کئی درجے بڑھ چکی ہوتی۔

ایک اور قابلِ غور پہلو یہ بھی ہے کہ اردو کو بطورِ ذریعۂ تعلیم، ترقی وترویج کا صحیح معنوں میں موقع دیے بغیر ہی اسے تعلیمی ناکامی کا سبب قرار دے دیا گیا ہے۔ حالانکہ اردو بطور ذریعۂ اظہار کبھی بھی ناکام زبان نہیں تھی۔ اردو والوں کو 'اپنی زبان

کی نوعیت، اس کے روزمرہ، اس کے طرزِ استعمال، اس کے ذخیرۂ الفاظ وغیرہ میں بہت دلچسپی'' رہی ہے۔ ''یہاں لغت نگاری یعنی الفاظ کو محفوظ کرنے، ان کے معنی اور استعمال کے بارے میں معلومات مہیا کرنے، ان کی اصل کے بارے میں کلام کرنے کا کام بہت پہلے شروع ہوگیا''(۳) تھا۔

اردو میں ترسیمیت (Graphization) یعنی رسم الخط کے مسئلے پر تو اتنی زیادہ توجہ دی گئی ہے کہ بعض مرحلوں پر تحریک کی صورت پیدا ہوگئی تھی لیکن اردو اِملا پر کما حقہ، توجہ نہیں دی گئی جس کی وجہ سے اِملا کا احوال بہت ہی دگرگوں رہا ہے۔ اِس صورتِ حال کے سبب ماہرینِ لسانیات اردو اِملا میں ''نراج اور انتشار''(۴) سے بھی بڑھ کر ''عذر کی صورتِ حال''(۵) کی نشاندہی کرنے لگے ہیں۔ اِملا کے قواعد کا تعلق زبانوں کے صرف ونحو (Syntax) سے بھی ہوتا ہے اور صوتیات (Phonology) سے بھی۔ اس سلسلے میں اِملا اور تلفّظ کے درمیان فرق کو بھی ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ زبان میں املا اور تلفّظ میں بعض مقامات پر فرق پایا جاتا ہے ''کسی لفظ کا تلفّظ (Pronunciation) اپنے مروّج اِملا سے خواہ کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو لیکن اس کا جو اِملا (Spelling) مقرر ہے، اسے اسی طرح لکھیں گے۔''(۶)

اگر میں یہ بھی کہہ دوں کہ زبانوں کا تاریخی ارتقاء یعنی Philology کو بھی اِملا کے تعیّن میں کہیں کہیں پیشِ نظر رکھا جائے تو ہوسکتا ہے کہ بعض علماء اس پر حیران ہوں کیونکہ اِملا کے تعیّن میں اردو کے لسانی ارتقاء سے بھی ہم نے عام طور پر غفلت ہی برتی ہے۔

اردو اِملا کو اکیسویں صدی میں جدید ذرائع ابلاغ، خاص طور پر موبائل فون کی ایس ایم ایس سروس اور الیکٹرانک میڈیا کی یلغار کا بھی سامنا ہے، جس نے اردو املا کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ بہت کم موبائل سروس والوں نے اردو میں سروس مہیا کر رکھی ہے اور نئی نسل اسے استعمال کرنے کی بجائے رومن اردو استعمال کرتی ہے یا پھر معیاری انگریزی اِملا کا بھی اردو کے ساتھ ساتھ بُرا حشر کر رہی ہے۔ اردو میں بھی صوتی فرق کو ملحوظ رکھنے کی بجائے مثال کے طور پر ذ، ز، ض اور ظ کی آوازوں کو آپس میں خلط ملط کرتی اور انگریزی میں see you کو c u لکھتی ہے۔ دوسری طرف اردو زبان کے اساتذہ غیر تربیت یافتہ ہیں یا لاپرواہیں۔ مقامی بولیوں کے قواعد اور لفظیات کا اِنھیں خیال ہی نہیں آتا جو اردو کی بنیاد ہیں۔ وہ عربی زبان کی ساخت سے بھی نابلد ہیں اور فارسی سے بھی ناواقف ہیں۔ ان میں تحقیق اور مطالعے کا فقدان ہے۔ مستند لغت سے وہ رجوع نہیں کرتے اور اسی لیے س، ص، ث کی صوتیات اور ان کے صحیح استعمال پر خود بھی قادر نہیں ہیں اور زبان و بیان کی واجبی سُوجھ بوجھ کے ساتھ انھیں غیر مذکور الفاظ کی حرکات و سکنات کی صحت اور سقم کو پرکھنے کا سلیقہ بھی نہیں(۷) رموزِ اوقاف کا معاملہ بھی کمپیوٹرائزڈ کمپوزنگ کے مختلف پروگراموں میں ابھی اصلاح کے عمل سے گزر رہا ہے۔ الغرض ان نئی ایجادات نے زبان و بیان کے سیکھے ہوئے قواعد، اِملا کے اصول اور تلفّظ کے اصول اور معیارات بھلا دیے ہیں۔ انٹرنیٹ سے جہاں معلومات تک رسائی آسان ہوئی ہے وہاں اردو زبان پر غیر زبانوں کا دباؤ بڑھ گیا ہے ''آج اردو تحریر و تقریر میں انگریزی، ہندی اور دیگر زبانوں کے الفاظ

اور طریقِ استعمال بے دریغ برتے جا رہے ہیں' وہ یہ جاننا ہی نہیں چاہتے کہ ''ان الفاظ اور طریقوں کو اردو سے کوئی مناسبت ہے کہ نہیں یا اردو کو ان کی ضرورت بھی ہے کہ نہیں۔''(۸) اور اس ناگفتہ بہ صورتِ حال پر مستزاد یہ بدیہی حقیقت ہے کہ معیاری اردو بھی بھولتے جا رہے ہیں اور پوری کوشش کے باوجود صحیح انگریزی ہمیں آئی نہیں یعنی پاکستانی قوم اس وقت ایک گونگی قوم ہے۔

اگرچہ کسی بھی بڑی زبان کی طرح اردو میں بھی دوسری زبانوں کے الفاظ کے انجذاب کی صلاحیت موجود ہے تاہم اس عہد میں غیر زبانوں کے دباؤ پر اردو دانوں کی تشویش اس لیے قابلِ فہم ہے کہ بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں میں دوسری زبانوں کے الفاظ اور اصلاحات کی اردو کے قواعد کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے معیار بندی اور قبولیت کے ساتھ ساتھ فرہنگوں اور لغات کا باقاعدہ حصہ بنانے کے لیے کوئی ادارہ یا ادارہ جاتی نظام موجود نہیں ہے اگر کوئی ایک آدھ ادارہ ہے بھی تو وہ اس میدان میں یا تو اپنی ذمّہ داریوں کا ادراک نہیں رکھتا یا ان کی طرف توجہ نہیں دیتا۔

بشریات کے ماہرین کی نظر میں زبان اپنی روح میں واحد عالمگیریت ثقافت کا بنیادی مظہر سمجھی جاتی ہے۔ یہ ایک بین اللّسانی انسانی قدر کے طور پر پہچانی جاتی ہے۔ یوں اس کا مزاج غیر مقامی اور لامذہبی ٹھہرتا ہے۔ لیکن تاریخی کروٹوں نے اور سیاسی مجبوریوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی بطور ایک قوم شناخت کے لیے اردو کو ایک اہم عنصر قرار دلوا دیا۔ اس لیے بھی بھارت میں اردو کے ساتھ جو تعصّب ابتداء میں برتا گیا وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اور بھی اضافہ ہوتا گیا جو بعض اوقات صریح دشمنی کی حدوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بھارتی حکومت اردو کی ترویج پر پاکستانی حکومت سے زیادہ رقم سالانہ خرچ کرتی ہے۔

مسلمانوں کو یہ بات پہلے بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور شاید اب بھی سمجھ میں نہ آئے کہ اردو مسلمانوں کی ساختہ نہیں اور نہ ہی اس کا جنم فارسی یا عربی سے ہوا ہے۔ اس کی تاریخی گرامر اور ہندوستان کی زبانوں کے تقابلی مطالعے کا نچوڑ یہی ہے۔ البتہ مسلمانوں نے اس زبان کی نگہداشت اور پرداخت ضرور کی ہے اور صرف پرداختہ ہونے پر اردو کس طرح مسلمانوں کی ساختہ سمجھی جا سکتی ہے۔(۹) لیکن ضد کی حد تک پہنچے ہوئے اس ذہنی رجحان کے سبب اردو کے لیے مشکلات ضرور پیدا ہوئی ہیں۔ جیسا کہ بھارت میں ہندی۔ اردو تنازعے اور سابق مشرقی پاکستان میں اردو۔ بنگلہ کشمکش کی تاریخ سے واضح ہے۔

پاکستان بننے کے بعد اردو زبان کو پاکستانی معاشرے میں درپیش مسائل میں سے ایک اس کا کثیر اللّسانی ہونا بھی ہے جس کا سرسری ذکر پہلے آ چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو پاکستان کے کسی خِطّے کے لوگوں کی مادری زبان نہیں تھی۔ تھی، میں نے اس لیے کہا کہ اب کراچی، حیدرآباد اور سکھر کے شہری علاقوں کی آبادی میں اردو بطور مادری زبان بولنے والوں کی خاصی تعداد موجود ہے اور اس وجہ سے سندھ سے الگ ایک علیحدہ صوبے کی تشکیل کے لیے دبی دبی آوازیں بھی اٹھتی رہتی ہیں۔

کثیر اللّسانی معاشرے میں پہلے مشکل یہ نفسیاتی رکاوٹ اردو زبان کو ابتدائی تعلیم کے لیے ذریعۂ تعلیم قرار دینے میں پیش آتی رہی ہے کیونکہ ماہرینِ تعلیم متفق ہیں کہ ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہونی چاہیے اور اردو پاکستان کے عوام کی اکثریت

کی مادری زبان نہیں ہے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ پنجابی، سندھی اور سرائیکی کو چھوڑ کر پاکستان کی دوسری زبانیں مثلاً بلتی، کھوار، شنا، بروشسکی، براہوی، بلوچی، پشتوں اور ان کے لہجے اردو سے مختلف لسانی خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ گریرسن نے بھی لینگوا ایج سروے آف انڈیا میں انھیں مختلف لسانی خاندانوں میں شامل کیا ہے۔ اس وجہ سے پاکستان کے مختلف علاقوں میں اردو زبان کو سیکھنے، سمجھنے، بولنے، پڑھنے اور مطالعہ کرنے'' کی مہارت یکساں درجے کی نہیں ہے۔ لیکن جس علاقے کے طالب علموں کے لیے زبان اور ادب کی درسی کتب مرتب کی جاتی ہیں اس کے مخصوص لاقائی، لسانی اور ثقافتی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے درسی کتاب مرتب''، نہیں کی جاتی۔ (۱۰) نہ ہی نصاب سازی کے وقت بنیادی اصول مرتب کرتے ہوئے ہر علاقے کے مخصوص لسانی مسائل، ثقافتی تنوع اور مشکلات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ مشکلات اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی ہیں کیونکہ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ساٹھ سال میں کوئی علیحدہ لسانی پالیسی تشکیل نہیں دی گئی اور نہ ہی کسی ثقافتی پالیسی یا تعلیمی پجالیسی میں مختلف زبانوں کو ایک دوسرے کے باہمی اشتراکات کو اجاگر کرنے کے بعد مزید قریب لانے کے اقدامات تجویز کیے گئے ہیں بلکہ تعلیمی پالیسی میں تو بالآخر انگریزی ہی کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر اختیار کر لیا گیا ہے۔ یہ شاید متّفقہ لسانی پالیسی نہ ہونے کے سبب ہی سے ہے کہ اردو زبان انگریزی کی بجائے پاکستان کی دوسری زبانوں کے مقابل کھڑی ہے۔ اس بارے میں ایک اور مخمصہ یہ ہے کہ متنوّع اللّسان معاشروں میں لسانی پالیسیوں کے تقاضے نسبتاً محدود اور مختصر گروہوں میں بولی جانے والی زبانوں کی ترقی کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ اردو میں لغات نویسی کی روایت خاصی پختہ اور قدیم ہے۔ اصطلاح سازی میں بنیادی نوعیت کا کام علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی، جامعہ ملّیہ، دہلی اور عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد دکن نے بہت پہلے شروع کر دیا تھا۔ فارسی اور عربی زبان کے اردو کے ہمہ نوع تعلق کی وجہ سے اصطلاح سازی کے ذریعے دقیق نظری مضامین اور تکنیکی معلومات کی تفہیم ممکن ہوئی ہے۔ ایہ امرِ واقعہ ہے کہ اظہاری تشکیلات میں اردو نے عربی اور فارسی کے ساختی اجزاء اور مجموعی مزاج سے استفادہ کیا ہے۔ ان میں نہایت عمیق سطح پر علوم وفنون کے لیے عمومی اساس موجود ہے جس پر بہت بڑی عمارت استوار کی جاسکتی ہے لیکن بعض تاریخی مجوریوں اور سیاسی چالوں کے سبب عربی اور فارسی سے ہمارا تعلق کمزور پڑ چکا ہے۔ اس لیے اردو لسانیات کے حوالے سے ان اداروں کے قابلِ فخر کام سے استفادہ نہیں کیا جا رہا۔ اس کام میں وسعت کی خواہش تو ایک طرف معروف علمی سرچشموں سے قطعِ تلق کے بعد انھی خطوط پر اردو اصطلاح سازی مترجم اور قاری دونوں کے لیے مشکلات پیدا کرنے لگی ہے۔ یہی الجھنیں ہیں جن کے سبب اردو میں جدید علوم کے لیے الگ الگ یا مجموعی قسم کے انسائیکلو پیڈیاز کا فقدان ہے۔ اردو بازاری ترجموں پر مبنی تجارتی نوعیت کے غیر معیاری اور غیر مستند یک جلدی یا دو جلدی عمومی انسائیکلو پیڈیاز کے نام پر علمی اور زبان و بیان کی غلطیوں سے پُر ان کتابوں کو اردو کے فروغ کے لیے قائم مقتدرہ سرکاری ادارے متعلقہ علوم کے مستند علماء اور اساتذہ کی عرق ریزی اور چھان پھٹک کے بغیر ہی قبول کر کے چھاپنے کی کوشش میں ہیں یا محض کارکردگی دکھانے کے لیے چھاپتے رہتے ہیں۔ اردو زبان کو ذریعۂ معاش بنانے والے سرکاری اداروں کے ایسے سربراہان جو اداروں کو اپنے ذاتی ایجنڈوں کے لیے استعمال

کر رہے ہیں اور جامعات اور کالجوں میں اردو زبان و ادب پڑھانے والے اساتذہ کے اردو کے بارے میں رویے کی چشم کشا حقیقتِ حال بھارت کے ایک اردو دان فیروز بخت احمد نے یوں بیان کی ہے:

> اردو کے بڑے بڑے محقق اور پروفیسر حضرات اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھانا تو دور رہا، اردو سکھاتے تک نہیں۔ کچھ عرصہ قبل دہلی کے غالب اکادمی میں ایک کانفرنس اردو کے ساتھ ناانصافی کے سوال پر چل رہی تھی۔ اسٹیج کے اوپر اردو کے نامور پروفیسر حضرات براجمان تھے۔ وہ سبھی اردو کی بدحالی پر اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ تبھی سامعین میں سے ایک صاحب سید فرید احمد جو دہلی کے ایک سرکاری اسکول میں اردو کے ٹیچر ہیں، اُٹھے اور اُنھوں نے کہا کہ جب تک اردو کا استحصال کرنے والے اور اسے اپنی نجی ترقی کا زینہ بنانے والے پروفیسروں کی برادری اردو اسٹیجوں کی زینت بنی رہے گی تب تک اردو کا کچھ بھلا ہونے والا نہیں ہے۔ اُنھوں نے مزید کہا کہ یہ حضرات اسٹیج سے نیچے آئیں اور زمین سے جُڑ کر کام کریں تو اُنھیں کچھ اندازہ ہو کہ اردو کے حقیقی مسائل کیا ہیں اور اُنھیں کن طریقوں سے حل کیا جا سکتا ہے۔ فرید احمد صاحب کی بات میں بڑی سچائی ہے کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے بڑے بڑے پروفیسر اردو کے نام پر موٹی موٹی تنخواہیں گھر لے جانے کے سوا اردو کے لیے کچھ نہیں سوچتے۔ نہ کچھ کرتے ہیں۔ اردو کی راہ میں سائل، مشکلیں بہت سی ہیں۔ ان میں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں میں نہ سبھی مضامین کے اساتذہ موجود ہیں اور نہ ہی وقت پر درسی کتابیں دستیاب ہوتی ہیں۔ ایک مسئلہ بچوں کے معاشی مستقبل کا بھی لوگوں کے ذہنوں میں رہتا ہے۔ وہ اسی زبان کو ترجیح دیتے ہیں جو آگے چل کر معاشی طور پر فائدہ مند ثابت ہو۔ دہلی کی ایک تنظیم فرینڈز فار ایجوکیشن نے اب سے تقریباً دس سال قبل ایک سروے کیا کہ ایسے کتنے اردو پڑھانے والے اساتذہ ہیں جن کے بچے اردو میڈیم اسکولوں میں زیرِ تعلیم ہیں۔ اساتذہ سے بات چیت کر کے پتہ چلا کہ 90 فیصد ایسے اردو ٹیچر تھے جن کے بچے انگریزی میڈیم اسکولوں میں زیرِ تعلیم تھے۔''(۱۱)

اس مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جس کی طرف فیروز بخت کی توجہ نہیں گئی کہ ہمارے ہاں اردو کے اساتذہ دراصل اردو ادب کے اساتذہ ہیں۔ اردو لسانیات کی ان کے لیے حیثیت یوں بھی ضمنی ہے اور ان میں سے کم ہی اس بارے میں کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

تاہم اس واقعے کے بعد فیروز بخت احمد نے اس صورتِ حال پر اپنے تاسّف کا اظہار یوں کیا ہے:

> اردو کے ساتھ چاہے کچھ بھی ہوتا رہے، اردو والوں کو اس کا کوئی خیال نہیں۔ جس زبان کو اپنی زبان کہنے والوں کی یہ ذہنیت ہو، اس کا یہی حال ہوتا ہے۔(۱۲)

بالاسطور میں اب تک جن نکات، تاریخی کروٹوں، اقدامات اور مسائل کا تذکرہ ہوا اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کو کبھی بھی سرکاری سرپرستی خلوصِ نیت سے حاصل نہیں رہی لیکن مخالفانہ رویوں اور ناسازگار حالات کے باوجود اسے

فطری طور پر فروغ حاصل ہوتا رہا۔ اس سخت جان زبان کی جڑیں برِّصغیر کی معاشرت میں بہت گہری اتر چکی ہیں اور اس نے اپنے آپ جدید ترین اور بڑی زبانوں کی خصوصیات رفتہ رفتہ اپنے انداز مجتمع کر لی ہیں۔ اس زبان نے سمعی نطقی رابطے، نشری ترسیل اور سمتی موصولی، فوری تحلیل، مبادلیت، کلّی بازرسی، اختصاص، طبیع ثقافتی معنویت، تفہیمی بے قاعدگی، ثقافتی امتیاز، بے مقامیت، تازہ کاری، روایتی ترسیل اور ثنویاتی ترتیب جیسی صلاحیتوں کو ایک حد تک پیدا کر لیا ہے۔ لسانی تغیّر و تبدل میں زمانی گہرائی اور مقامی زبانوں، بولیوں اور پراکرتوں کے ساتھ اردو کے تقابلی مطالعے کی کمی کو بھی پورا کرنے کی کوشش کی جائے تو دیگر قومی زبان کے ساتھ اس کی محاذ آرائی کی جو فضا پیدا کی گئی ہے وہ بھی خوشگوار اور اردو کے لیے سازگار ہو سکتی ہے۔ اردو زبان کے ساتھ ساتھ دیگر پاکستانی اور ہندوستانی زبانوں کے فروغ کے ادارے بھی پوری تن دہی سے متعلقہ زبانوں کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہیں۔ اگرچہ اداروں کے مابین بامعنی رابطوں کا فقدان ہے تاہم پاکستان میں تو ان زبانوں کا رسم الخط ایک ہے اور ان زبانوں کے الفاظ غیر محسوس طور پر ایک دوسرے کی لغات کا حصّہ بن رہے ہیں۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے تو اس زبان کا ذخیرۂ الفاظ اس کے ثقافتی تسلسل کے مختلف مدارج اور اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل کی پہچان کا ذریعہ بن چکا ہے اور اس کی گہرائی اور وسعت کا بھی آئینہ دار ہے۔ اس کے ذخیرۂ الفاظ میں ہر طرح کے قدیم الفاظ، قانونی اصطلاحات، فنی، پیشہ ورانہ، علمی، تکنیکی، مذہبی، عامیانہ، روزمرّہ یا عام بول چال کے شکستہ الفاظ، محاورے اور ضرب الامثال داخل ہو چکے ہیں اور آئندہ بھی اردو اپنی اثر پذیری، اور اخذ و اکتساب کی حیرت انگیز صلاحیت کے سبب نت نئے الفاظ قبول کرتی رہے گی۔

اردو کی ایک خوبی جو اسے ہمیشہ ایک متحرک زبان کے طور پر زندہ رکھے گی وہ اس کا عام بول چال کا یا رابطے کی زبان ہونا ہے۔ تحریری زبان تو جمود اور قدامت کا شکار بھی ہو سکتی ہے لیکن عام بول چال کی زبان بدستور معین رہتے ہوئے اپنے دائرۂ کار میں فطری طور پر پھلنے پھولنے کا عمل جاری رکھتی ہے۔ ارتقائے زبان کے حوالے سے نئے الفاظ اور کلمات سے لغات کی توسیع اور ہیئت کی تبدیلیوں کے ساتھ نئے اسالیب کی جستجو کی خوبیوں کے سبب اردو کا ارتقاء جاری رہے گا چاہے ماہرانہ فکر و دانش کے لیے اردو کو بطور تکنیکی زبان ترقی دینے میں سرکاری یا غیر سرکاری رکاوٹیں باقی رہیں۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ لسانی مسائل کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں بچوں کو تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جانی چاہیے چاہے اسے غیر ملکی زبان کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اس کے نتیجے میں اقدار کے یکسر بدل جانے کا خدشہ ہو تب بھی، کیونکہ غیر ملکی زبان میں تعلیم اور دورخی لسانی پالیسی سے اشرافیہ (ELITE) اور عوام الناس (MASSES) کے درمیان خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جائے گی جس کے نتائج انتہائی بھیانک ثابت ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں مسترد کی جانے والی زبان بولنے، سمجھنے اور لکھنے والی اشرافیہ کے ردِّعمل کو بالکل خاطر میں نہیں لانا چاہیے کیونکہ قوم کا وسیع تر مفاد اس میں پوشیدہ ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ لسانی پالیسیوں کو مرتب کرنے والے افراد یا تو اشرافیہ سے تعلق رکھتے ہیں یا ان کے حلقۂ اثر سے نکلنے کے قابل نہیں ہوتے۔ موجودہ حالات میں بے حد ضروری ہے کہ لسانی مسائل اور لسانی پالیسیوں کی تشکیل کے لیے قومی سطح پر کوئی دوررس تھیوری بنائی جائے۔ ایک ایسی تھیوری جس میں نہ صرف یہ کہ مسائل کی وضاحت کی گئی ہو بلکہ ان کا علاج

بھی تجویز کیا گیا ہو، اور جسے عملی طور پر نافذ کرنا ممکن ہو۔ اگر ایسا ہو جائے تو اردو کو اس کا حق ملنے کا امکان دوسری پاکستانی زبانوں کے تحفّظ کے ساتھ ساتھ پیدا ہو سکتا ہے۔

حواشی/حوالہ جات

۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی: لغاتِ روزمرّہ، انجمن ترقیِ اردو ہند، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص۔۱۱۔

۲۔ اِنشاءاللہ خان انشاء: دریائے لطافت، انجمن ترقیِ اردو ہند، دہلی، ۱۹۳۵ء، ص۔۲۵۳۔

۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی: فلیپ، کرنٹ اردو۔ انگلش ڈکشنری مؤلّفہ: حافظ صفوان محمد چوہان و سید محمد ذوالکفل بخاری، غلام رسول اینڈ سنز، لاہور، ۲۰۰۹ء۔

۴۔ (ڈاکٹر) فرمان فتحپوری: اردو املا اور رسم الخط، اصول و مسائل، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص۔۶۔

۵۔ شاہد شیدائی: اداریہ، کاغذی پیرہن، لاہور، شمارہ ۲۲، جولائی۔اگست ۲۰۱۰ء، ص۔۷۔

۶۔ (ڈاکٹر) فرمان فتحپوری: کتاب مذکور، ص۔۶۔

۷۔ (مولانا) محمد بشیر الصّدیقی: اصلاحِ تلفّظ، مکتبۂ کارواں، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص۔۷۔۸۔

۸۔ (ڈاکٹر) خلیق انجم: دیباچہ، لغاتِ روزمرّہ مذکور، ص۔۱۰۔

۹۔ (ڈاکٹر) شوکت سبزواری: اردو زبان کا ارتقاء، گہوارۂ ادب، ڈھاکہ، ۱۹۵۶ء، حرفِ اوّل۔

۱۰۔ (ڈاکٹر) شاہد اقبال کامران: پاکستان میں تدریسِ اردو، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۷۷۔۲۷۸۔

۱۱۔ فیروز بخت احمد: کچھ اردو زبان کی ترویج کے بارے میں، مشمولہ 'اردو دنیا' نئی دہلی، شمارہ جنوری ۲۰۱۰ء، ص۔۲۶۔

۱۲۔ ایضاً: ص۔۲۸۔